عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی!!

اِدارۂ اشرفیہ عزیزیہ کا ترجمان

ماھنامہ

ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ / مئی ۲۰۰۵ء

مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ

ارادہ ایمان کسبی ہے اور عطائے ایمان وھبی ہے

اللہ تعالیٰ کی ذات عالی وہ ذات ہے جس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی۔

﴿لا تمنوا علی اسلامکم﴾ سورۃ الحجرات، آیت ۱۷۔

ترجمہ:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مُجھ پر اپنے اسلام لانے کے احسان کو نہ دھرو بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان مانو جس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی۔ ایمان عطا ہے اور عطائے رب کی صورت میں ملے گا اور وہبی ہوگا لیکن اس میں سمجھنے کی دو چیزیں ہیں، امام ابو حنیفہؒ اور امام ماتریدیؒ کے نزدیک ایک ایمانِ اصلی ہے جو گھٹتا بڑھتا نہیں اور ایک ایمان شرعی ہے جو گھٹتا بڑھتا ہے۔ ایمان اصلی بیجِ ایمان ہے، اگر یہ نہ ہو تو پھر انسان کافر ہوگا۔ اور یہ اُس وقت تک کفر سے مبدل نہیں ہوگا جب تک انسان ارادہ سے لوازماتِ دین سے انکار نہ کرے۔ ایمان شرعی نیک اعمال سے بڑھتا ہے اور بد اعمال کی وجہ سے گھٹتا ہے۔ اور بعض اوقات اعمالِ بد کی کثرت اور اس پر استمرار سے سلب بھی ہو جاتا ہے۔

﴿والذین اھتدوا زادھم ھدی﴾ سورۃ محمد آیت ۱۷۔

جو لوگ ہدایت پائے اللہ ان کی ہدایت کو بڑھاتا ہے۔

ارادۂ ایمان کسبی ہے اور عطائے ایمان وہبی ہے۔ آدمی ارادہ کرے گا تو اللہ پاک ایمان عطا فرمائیں گے۔ جب یوسف علیہ السلام نے ارادہ کیا تو تالے خود بخود ٹوٹ کر نیچے گر گئے۔ اور وہ دروازہ بھی ایک نہیں تھا بلکہ بہت سے دروازوں پر تالے لگائے تھے۔ ''قال معاذ اللہ'' یوسف علیہ السلام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ۔ وہ میرا پرورش کرنے والا ہے اور اس نے مُجھے اچھا ٹھکانا دیا ہے۔ اس عورت (زلیخا) نے پختہ ارادہ کرلیا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام بھی پختہ ارادہ کرلیتے اگر اللہ کی طرف سے اس کام کے حرام ہونے کی پختہ دلیل ان کے پاس نہ ہوتی۔

ارادہ پر نتائج کا ترتب ہوتا ہے۔ آپ نے گوالے سے کہا کہ دودھ دے دو۔ اس نے کہا کہ برتن لاؤ۔ آپ نے چھانی آگے کی تو چھانی میں دودھ کیسے لوگے۔ قرآن نے کہا۔

﴿یا ایھا الناس اعبدوا ربکم﴾ ا سورۃ البقرہ آیت ۲۱۔

﴿افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ﴾ ۲ سورۃ الزمر۔ آیت ۲۲۔

جس کے سینہ کو ہم اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ایک کُھلی روشنی پر ہوتے ہیں۔

دل کے اندر اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا بیج یوم ''الست'' میں ڈال دیا تھا۔ اگر اس پر ارادہ انسانی ہوگا تو اس پر فیضان ہدایت ہو جاتا ہے۔ کافر اصل میں ایمان کا ارادہ نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ ایمان و ہدایت کی دولت سے نوازے۔ حضور ﷺ کی ایک دُعا ہے اے اللہ مسلمانوں کے دلوں میں ہدایت بھی ڈال دے اور حکمت بھی ڈال دے۔ جب کوئی شخص ایمان کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ اس کو ایمان کی دولت سے نوازتے ہیں۔ ایمان کی دو نوعیتیں ہیں ایک موہبت خاصہ ہے اور ایک موہبت عامہ۔

دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں
ہو عطائے خاص مجھ پر جو عطائے عام ہے

موہبت خاصہ میں ارادہ ہو یا نہ ہو بس جس پر نگاہِ خاص ہوگئی اس کا کام بن گیا۔ چاہے تو بت خانہ سے نکالے اور مسجد میں کھڑا کر دے۔

﴿اللہ یجتبی الیہ من یشاء ویھدی الیہ من ینیب﴾ سورۃ الشوریٰ آیت ۱۳۔

اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اس کو منتخب کرے اور جو ان کی طرف رجوع کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دیتے ہیں۔

ایک اجتباء کی راہ ہے یعنی ہدایت خاصہ کی راہ، یہ راہ ہمارے اختیار میں نہیں۔ ہمارا معاملہ اللہ کے ساتھ جھگڑے کا نہیں کہ فلاں کو کیوں منتخب کیا اور مجھے کیوں نہیں کیا۔ بزرگوں میں ابدال ہوئے ہیں اگر ایک ابدال دُنیا سے اُٹھ جاتا ہے تو فوراً دوسرا اس کی جگہ پر مقرر ہوجاتا ہے۔ ابدال عموماً ایک وقت میں ۷۰ ہوتے ہیں۔ قطب (غوث) ایک ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک قطبِ تکوین ہوتا ہے اور ایک قطبِ ارشاد ہوتا ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ہدایت کو عام کرتا ہے۔

﴿﴿﴿﴿وتد﴾﴾﴾﴾ چار ہوتے ہیں۔ یہ ایمان کے پہاڑ ہیں ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ایمان دیتا ہے۔

عبدالقادر جیلانیؒ کے وقت میں ایک ابدال کا انتقال ہوگیا۔ عبدالقادر جیلانیؒ ایک ہی وقت میں قطبِ تکوین بھی تھے اور قطبُ الارشاد بھی تھے۔ تہجد کے وقت اُٹھے ایک قدم لیا اور پھر دوسرا قدم لیا تو ایک دوسرے شہر کو پہنچ گئے۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ صاحبِ کرامات تھے۔ ایک گرجا میں پہنچے وہاں ایک پادری کی صلیب توڑی اور اس کو کلمہ پڑھایا اور ایک مسجد میں داخل کیا۔ خادم بھی ساتھ تھا اس نے کہا کہ کیا معاملہ ہے؟ (وہ خادم ایسے ساتھ ہوگیا تھا جیسے ایک چیونٹی پشاور کے ہوائی اڈہ پر پھر رہی تھی اور ایک ہوائی جہاز کے اوپر چڑھ گئی۔ ہوائی جہاز اُڑا اور چیونٹی بھی جدہ پہنچ گئی)۔ یہ حضرت جیلانیؒ کرامت کی تھی۔ خادم کو فرمایا کہ فلاں ابدال کا انتقال ہوگیا، اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اس کی جگہ فلاں پادری کو مقرر کیا جائے، جاؤ اس کو کلمہ پڑھاؤ۔ تو یہ عطائے خاص ہے چُن لیتے ہیں، اپنا بنا لیتے ہیں۔ دوسری راہ عمومی ہے کہ انسان توبہ کرے اور نیکی پر چلنے کا ارادہ کرے۔ اللہ تعالیٰ ارادہ پر ھدایت کا ترتب فرماتا ہے۔ اسلام سے پہلے جتنے بھی گُناہ کئے ہوئے ہوتے ہیں وہ اسلام لانے سے اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتے ہیں۔ ہدایت دے دیتے ہیں، ایمان دے دیتے ہیں، اب مؤمن ہوگئے۔ موہبتِ خاصہ میں انسان کے ارادہ پر ایمان و ہدایت کا ترتب نہیں۔ جبکہ موہبتِ عامہ میں ارادہ کو اللہ تعالیٰ قبول فرما کر اپنی عطا سے نوازتے ہیں۔

بہرحال جو بھی ہدایت آئے گی اللہ تعالیٰ کی ذات عالی سے آئے گی۔ اس لئے کہتے ہیں کہ عمل کے بعد قبولیت کی فکر چاہیئے۔

حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ عمل میں کمی کا غم ہو اور قبولیت کی فکر ہو۔ اگر عمل قبول ہوگیا تو خاک سونا ہوگئی۔ اور اگر قبول نہ ہوا تو سونا خاک ہوگیا۔ عام طور پر اللہ کا فضل ہی شامل حال ہوتا ہے۔

فضل ساعت کار صد سالہ کند

نار ابراہیم را لالہ کند

فضل ہو جائے تو سب کام بن جاتے ہیں۔ عموماً اللہ تعالیٰ کا معاملہ فضل ہی کا ہے ورنہ جو اعمال ہمارے ہیں ان میں اپنی صلاحیت قبولیت کی نہیں۔

گلا سڑا پھل اگر بادشاہ کے پاس بطور تحفہ بھیجو تو کیا وہ قبول کرے گا۔ خدا تو ستّار ہے چشم پوشی کرتا ہے۔ مُجھ جیسے روسیاہ کی بھی پردہ پوشی کرتا ہے۔ شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے ''در ہر کار فضلِ الٰہی در کار''، جب فضل الٰہی شامل حال ہو جاتا ہے تو بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ٹوٹے پھوٹے ارادہ کو اپنے فضل سے قبول فرما لیتے ہیں۔ ...... میں تو کچھ نہیں لیکن اے اللہ تو تو سب کچھ ہے، میرے ہیچ پنے کو اپنے سب کچھ سے پورا کر دے۔ ......
اس طور پر اللہ تعالیٰ ارادہ کو قبول فرما کر ہدایت دے دیتے ہیں۔ اس کے بعد جو اعمال ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کا مفہوم ہے کہ کوئی بھی اپنے عمل سے نہیں بخشا جائے گا الاّ یہ کہ اللہ تعالیٰ فضل فرما دے۔ کسی نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ بھی؟ فرمایا کہ ''ہاں''۔ توفیقات اعمال خیر کو وجود میں لاتے ہیں۔ ہر توفیق عمل میں مستقلاً ہدایت ہے اور یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی ذات سے آتی ہے۔ جس طرح آپ نے کھیتی بو دی۔ بیج ڈال دیا۔ ایسا علاقہ کہ جہاں پانی نہیں تو جب رحمت حق بارش اُتارے گی۔ تو وہ بیج اُگ جائے گا۔

پلا دے ساغر سر شار مُجھ کو وہ ساقی

خزاں کو ایک اشارے میں جو بہار کرے

ایسی عطا کی بارش اے اللہ کر دے۔ کہ میری اُجڑی ہوئی زندگی ایک اشارہ میں بہار ہو جائے۔ جیسے ابر نیسان کا قطرہ سیپی کے منہ میں گرتا ہے۔ تو وہ موتی بن جاتا ہے۔ تو جب توفیق الٰہی بندہ کے دل کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ تو انسان کے اعمال موتی بن جاتے ہیں۔ اور یہ موتی دائمی ہیں۔ اور سیپی کا موتی چند دن کا ہے۔ یہ بے آب ہوسکتا ہے اور وہ نہیں۔

﴿والباقيات الصالحات خير عند ربك ثوابا و خير املاً﴾ ۱؎۔

ترجمہ۔ اور باقی رہنے والی نیکیوں کا بہتر ہے تیرے رب کے یہاں بدلہ اور بہتر ہے توقع ہے۔ (ترجمہ شیخ الہند) ایسے ہی ہدایت کا قطرہ جب دلوں پر اُترتا ہے تو اللہ تعالیٰ عمل کا موتی بنا دیتے ہیں۔ یہ اعمال کے موتی ایک دن کے نہیں یہ دائمی موتی ہیں۔ اس دُنیا میں آبرو ہے۔ قبر میں نور ہے۔ حشر میں نجات ہے۔ اور جنت میں نعمتیں انہیں موتیوں کے بدلے ملیں گے۔

۱؎ سورۃ الکہف۔ آیت ۴۶۔

﴿والذين اهتدوا زادهم هدى﴾ ۱؎

توفیقات عمل کا ملنا ہدایت کو بڑھاتا ہے۔ یہ بھی موہبت کبری ہے۔ خدا کی عطائے عام بھی عطائے خاص ہے۔ ایمان اللہ کی دہش ہے۔ عطا ہے۔ لیکن ارادہ پر ہے۔

﴿نية المومن خير من عمله﴾۔

مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔ جس پر فوراً ترتب ہوتا ہے۔ ایسے ہی جب پختہ ارادہ کرے تو ثواب کا ترتب شروع ہو جاتا ہے۔

﴿فاذا عزمت فتوكل على الله﴾ ۲؎۔

جس کسی چیز کا پختہ ارادہ کرے تو اللہ پر بھروسہ رکھے۔

اگر ارادہ کو ہم سوچیں تو یہ ایک رُخ سے کسبی ہے۔ لیکن ارادہ بھی ان کا فضل ہے اور ہر نیکی کا ملنا خدا کا خاص فضل ہے اپنے بندہ پر۔

۱؎ سورۃ محمد۔ آیت ۴۷۔

۲؎ سورۃ آل عمران

اہل سنت والجماعت

فرقوں کی ملکی تقسیم:

ہم نے پہلے لکھا ہے کہ ان فرقوں نے قومی تقسیم کے علاوہ ملکی تقسیم بھی حاصل کر لی تھی، شام میں

عثمانیہ وناصبیہ وغیرہ حامیانِ بنی اُمیہ تھے، اور عراق میں علوی اور اہل عجم تھے، بنواُمیہ نے میدانِ کربلا میں جگر گوشہ رسول کے ساتھ جو کچھ کیا، سرزمینِ حرم میں صدیقؓ کے نواسہ (ابن زبیرؓ) کو جس بیدردی کے ساتھ قتل کیا، امام زین العابدین کے دلبند زید شہید کا سر جس طرح اُتارا گیا، مدینۃ الرسول میں انصار کرام کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست وبازو تھے جس سفاکی سے تہ تیغ کیا، بصرہ کے محدثین اور علماء کا خون جس طرح بے دریغ بہایا، اس کو دیکھ دیکھ کر اور سُن سُن کر تمام مجمع اسلامی دم بخود تھا۔

<u>بنواُمیہ کے دور میں مذہبی فرقوں کا ظہور:</u>

تلوار کا جادو زبان کو گونگا کرسکتا ہے لیکن دل کا کانٹا نہیں نکال سکتا تھا۔ اس کے لیے مذہبی منتر کی ضرورت تھی آخر وہ منتر بنواُمیہ کو مل گیا اور وہ ''مسئلہ جبر'' تھا، یعنی یہ کہ انسان مجبور محض ہے جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے، اس لیے انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں اس کی ذمہ داری خدا پر عائد ہے ان وجوہ سے ان سفاکیوں کے وہ مجرم نہیں بلکہ نعوذ باللہ خود خدا ذمہ دار ہے۔

عراق کے اہلِ فکر نے اہل شام کے اس جواب کا جواب ''نظریہ قدر'' سے دیا، یعنی یہ کہ انسان اپنے تمام اعمال کا آپ ذمہ دار ہے، تقدیر کوئی شے نہیں، خدا نے اس کے افعال پر اس کو قدرت دے رکھی ہے، انسان خود جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے، یہ آواز سب سے پہلے عراق سے اُٹھی، اور سنسو یہ یا سوسن نام ایک عجمی نژاد؟؟؟؟؟ کی زبان سے بلند ہوئی، معبد جہنی نے اس کو اصولِ عقائد میں داخل کردیا۔ کچھ لوگ بصرہ سے حضرت ابن عمرؓ کے پاس آئے، اور عرض کی کہ ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے ہیں جو تقدیر کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام کام پہلے سے مقدر ہو کر نہیں بلکہ از سرِ نو ہوتے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ''ان سے کہہ دو کہ ہم کو ان سے تعلق نہیں اور ان کو ہم سے نہیں''، معبد جہنی نے مسئلہ قدر کو بصرہ کے علمی حلقوں تک پہنچایا، اور پھر رفتہ رفتہ اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔

معبد اور عطاء بن یسار، حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں آتے اور عرض کرتے کہ ''یہ لوگ (بنواُمیہ) خلقِ خدا کا خون بہاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ خدا کے حکم سے کرتے ہیں''، انہوں نے کہا ''خدا کے دشمن جھوٹ کہتے ہیں''۔ آخر معبد نے بغاوت کی اور عبدالملک اموی کے حکم سے قتل ہوا، معبد کے بعد عمرو ابن عبید، جعد بن درہم اور غیلان دمشقی وغیرہ نے اس کو دبنے نہ دیا، اور یہ سب یکے بعد دیگرے بنواُمیہ کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ ان کے قتل نے اس فرقہ میں اور زیادہ جوش برپا کردیا اور

ایک دوسرا اُصول ان میں مسلم ہوا کہ سفاکوں اور ظالموں کو ٹوکنا اور عدل انصاف کی دعوت دینا فرض ہے۔ ابتداء اس فرقہ کا نام قدریہ پڑا اور آخر بڑھتے بڑھتے یہی معتزلہ بن گیا۔

فرقوں کا انتشار :

اب وہ وقت آ گیا کہ امویہ کا دور گزر کر عباسیہ کا ستارۂ اقبال خراسان کی سرزمین سے طلوع ہوا، یونان وعجم کے فلسفہ نے زبانوں کی گرہیں کھول دیں، جس کے منہ سے جو بات نکلی وہ ایک مذہب بن گئی، عراق، خراسان، رے وغیرہ ایران کے بڑے بڑے شہر مذہب سازیوں اور فرقہ بندیوں کے مرکز بن گئے، خراسان میں جہم بن صفوان ترمذی پیدا ہوا جس نے تمام صفات الٰہیہ کا انکار کیا اور خدا کو مجبور محض فرض کیا۔ معتزلہ نے خدا کو صفات سے اس قدر منزہ کیا کہ وہ معدوم کے ہم معنی بن گیا۔ ابن کرام سیسانی نے رے میں خدا کی تجسیم کا وہ اعتقاد ظاہر کیا کہ ایک خوبصورت اور ثقہ صورت انسان بنا کر تخت پر بٹھا دیا۔ معتقدین تجسیم بھی ایک خیال پر متفق نہ ہوئے خراسان میں سلیمان مفسر نے یہ اعتقاد ظاہر کیا کہ خدا کا جسم گوشت اور پوست سے مرکب ہے، ہشام بن حکم نے گوشت پوست کے بجائے اس کو نورانی الجسم کہا، ہشام بن سالم جوالقی نے کہا خدا نور ہے گوشت پوست نہیں اوپر کا دھڑ مجوف اور نیچے کا دھڑ ٹھوس ہے، اس کے کالے کالے بال ہیں، انسانوں کی طرح حواس خمسہ رکھتا ہے، اُس کے ہاتھ ہے، پاؤں ہے، منہ ہے، ناک ہے، داڑھی نہیں۔ میاں بن سمناں نے کہا خدا کے جسم تو ہے لیکن وہ قیامت میں فنا ہو جائے گا صرف چہرہ رہ جائے گا۔ معتزلہ نے خدا کی رویئت کا انکار کیا۔ دوسروں نے کہا رویئت ان حواس خمسہ سے نہیں بلکہ ایک اور حاسہ سے ہوگی، جو قیامت میں خدا پیدا کرے گا۔ یہ بحث تو صرف خدا کی ترکیب کے لحاظ سے تھی، خدا کے صفات کی بحث اس کے بعد شروع ہوتی ہے، جہمیہ نے خدا کے صفات الٰہیہ سے انکار کیا کہ اگر صفات ہوں تو ان کی بقا بھی لازم آتی ہے اور دائمی بقا صرف خدا کی ذات کو ہے، نیز اگر صفات الگ ہوں تو ذات وصفات سے مل کر خدا کی ترکیب لازم آتی ہے جبکہ وہ ترکیب سے پاک ہے۔ معتزلہ نے کہا خدا کی عین بسیط ذات ہی صفات کی قائم مقام ہے، اس کے مقابل ظواہر نے کہا صفات، ذات سے الگ مستقل ہستی رکھتی ہیں۔ اشاعرہ نے کہا کہ صفات نہ عین ذات ہیں نہ خارج از ذات ہیں، کعبی بلخی نے کہا کہ خدا میں صرف ایک صفت علم ہے اور ارادہ اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے،

ایمان اور عمل ایک شے ہے، یا عمل ایمان سے خارج ہے؟ ایمان زبان سے صرف اقرار کا نام

ہیادل سے محض اعتقاد کا؟ یا زبان کے اقرار اور دل کے اعتقاد دونوں کے مجموعہ کا؟ ایمان میں کمی زیادتی ہوسکتی ہے، یا نہیں؟ خدا پر ایمان لانا عقلاً واجب ہے یا سمعاً؟، نبوت کا ثبوت عقل سے ہوتا ہے یا نقل سے؟ معجزہ ممکن ہے، معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں؟ معجزہ مخفی اسباب پر مبنی ہوتا ہے، یا محض خدا کے حکم سے ہوتا ہے، خدا کے احکام میں مصالح اور حِکَم ہوتے ہیں، یا اللہ تعالیٰ کی مشیتِ محض سے وہ احکام صادر ہوتے ہیں، خدا کے کام اسباب کے زیر اثر ہیں یا نہیں؟ قرآن کس حیثیت سے معجزہ ہے؟ قرآن کا جواب درحقیقت نہیں ہوسکتا تھا، یا ہوسکتا تھا، لیکن خدا نے انسان سے اس کی قدرت سلب کرلی ہے؟ قرآن میں وجہ اعجاز کیا ہے، اس میں پیشینگوئیوں کا ہونا یا اس کی عبارت کی فصاحت وبلاغت؟ قرآن کلامِ الٰہی کیونکر ہے؟ وہ قدیم ہے یا حادث؟ اس کے الفاظ بھی قدیم ہیں یا صرف معانی؟ جنت اور دوزخ اس وقت موجود ہیں یا قیامت میں ان کا وجود ہوگا؟ دوزخ کو بھی بہشت کی طرح دوام ہوگا یا قیامت کے بعد اس پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جب اس پر فنا طاری ہوجائے گی؟ قبر میں بندہ پر عذاب ہوتا ہے یا نہیں؟ دوزخ میں کفار سب ایک بار جلیں گے یا بار بار؟ خدا کو محال پر قدرت ہے یا نہیں؟ وہ ظلم کرسکتا ہے یا نہیں؟

امامت کا سلسلہ ہم نے چھیڑا نہیں کہ اس سے پھر ایک اور تسلسل پیدا ہوگا۔ یہ اور ان کے علاوہ سینکڑوں مسائل مختلف فرقوں کے عقائد کی صورت میں پیدا ہوئے، اور جس کی عقل نے جو بات کہی وہ ایک گروہ کا مذہب قرار پا گئی، چنانچہ یہ تمام مسائل مختلف فرقوں میں نفیاً یا اثباتاً اصولِ مذہب میں داخل ہیں، اور الملل والنحل کی کتابوں میں ان کی تفصیلات درج ہیں۔ یہ اختلافات صرف زبان اور دلائل تک محدود نہ رہے بلکہ بارہا دست وگریبان تک نوبت پہنچی۔ تیسری صدی میں اشعریت پیدا ہوئی، جس نے محدثین اور فقہاء میں حُسن قبول پیدا کیا کہ اس کا مسلک عقل ونقل اور معتزلہ اور ظواہر کے بیچ بیچ میں تھا، اس نے ایک طرف باقلانی ابن نورک، غزالیؒ اور رازیؒ کے زور بیان سے اور دوسری طرف ملک شاہ سلجوقی، سلطان محمود غزنویؒ، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ اور محمد بن تومرت موحدی (اسپین) کی تلواروں سے وہ قوت حاصل کی کہ تمام فرقے اسکے سامنے دب گئے، تاہم بغداد کی سرزمین جب تک شاداب رہی، حنابلہ اور اشاعرہ کے جن میں سے ہر ایک کتاب وسنت پر عمل وایمان کے دعویدار تھے، کبھی باہمی فتنوں سے خالی نہ رہی۔

ضلالت کے طبعی اسباب:

اسلام کے مختلف فرقوں کی پوری روداد اب آپ کے سامنے ہے، غور سے پڑھیئے اور دیکھئے کہ ان

اختلافات کا اصلی مبنیٰ اوران کی پیدائش کے اصلی اسباب کیا تھے؟ یہ کہ اسلام کی عملی زندگی کو چھوڑ کر صرف تخیل کی زندگی ان پر چھا گئی۔

خیال آرائی:

اسلام میں اختلافات کی جو بنیاد پڑی، جب تک ان میں عجمی عنصر غالب نہ ہوا وہ عمل اور زندگی کی جنگ تھی۔ وہ مذہب کی آمیزش کے بغیر خالص سیاسی اور پولیٹکل جنگ رہی، جس کے فیصلے کئی بار تلوار سے چاہے گئے۔ عجمیت کے عنصر نے پالیٹکس کو مذہب کے پردے میں چھپادیا اور تلوار کی جگہ شکوک وشبہات، استدلالاتِ عام فریب، تاویل فاسد، اور تغیر عقائد نے لے لی، نتیجہ یہ ہوا کہ تلوار کی جنگ گو مادی اجسام کو فنا کر رہی تھی لیکن قومی زندگی کی روح کو نہیں فنا کررہی تھی، قوم میں زندہ رہنے کا جوش وخروش تھا، لیکن خیال آرائی کے اس طرزِ جنگ نے زندگی کے اصل جوہر، مذہب کی اصل روح، اور عمل کی اصل قوت کو فنا کردیا۔

عقائد میں وسعت طلبی:

اسلام کے اصل عقائد نہایت سادہ اور مختصر ہیں، کوئی ان کو سمیٹنا چاہے تو صرف ایک لا الہ الا اللہ میں سمیٹ سکتا ہے، جیسا کہ اس حدیث میں ہے کہ **من قال لا اله الا اللّٰه دخل الجنة** ﴿جس نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوا﴾ اور اگر کچھ پھیلائے تو وہ سارے قرآن کو محیط ہے۔ اسلام نے اصولِ دین کو چھ دفعات میں یک جا کردیا ہے، اور وہ وہی ہے جو سورۂ بقرہ کے اول وآخر میں ہے، اور ایک حدیث میں ان کو بیان کیا گیا، ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالکتاب، ایمان بالملائکہ، ایمان بالیوم الاخر اور ایمان بالتقدیر، یہ دفعات صحابہؓ کے عہد میں بالکل سادہ تھے، مگر جیسے جیسے مسلمانوں میں خیال آرائی بڑھتی گئی ان میں نئے نئے مباحث بڑھتے گئے۔

اسلام عقائد کی وسعت اور کثرت کا شائق نہیں بلکہ ان کے رسوخ، استواری اور شدتِ اذعان ( ) کا طالب ہے، لیکن انسانیت کی بیمار فطرت ہمیشہ وسعت کی طرف جاتی ہے، خلاقِ فطرت کا فرستادہ اس رمز سے آگاہ تھا، صحیح بخاری میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا

لن يبرح الناس يتساء لون حتىٰ يقولوا هذا اللّٰه خالق كل شى فمن خلق اللّٰه،

ترجمہ: لوگ ہمیشہ ایک دوسرے سے بحث ومناظرہ کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے کہ اچھا خدا نے سب چیزوں کو پیدا کیا، پھر خدا کو لے کس نے پیدا کیا؟

تاویل متشابہات:

مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

هو الذی انزل علیک الکتاب منه ایات محکمات هن ام الکتاب و اخر متشابهات فاما الذین فی قلوبهم زیغ فیتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة و ابتغا ء تاویله و ما یعلم تاویله الا الله و الرسخون فی العلم یقولون امنا به کل من عند ربنا و ما یذکر الا اولو الالباب

ترجمہ: اس نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی جس میں کچھ آیتیں محکم اور واضح ہیں۔ وہ اصل کتاب ہے اور بعض متشابہ ہیں جنکے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہ کے پیچھے پڑتے ہیں، کہ فتنہ اٹھانے اور اس کے مطلب کو حل کرنے کے لیے حالانکہ اس کا حقیقی مطلب خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور جو لوگ علم میں پکے ہیں وہ کہتے ہیں، ہم اس پر ایمان لائے یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور علقمندوں کے سوا کوئی عبرت نہیں پکڑتا۔

پھر فرمایا

اذا رأیتم الذین یتبعون ماتشابه منه فاولئک الذین سمی الله احذروهم

ترجمہ: جب ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہ کے پیچھے پڑتے ہیں تو جانو کہ یہ وہی ہیں جن کا خدا نے نام لیا ہے تو ان سے احتراز کرو۔

اس بنا پر صحابہ کرامؓ سے اگر کبھی کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا جو اس ارشاد کیخلاف ہوتا تو آپ سخت برہم ہوتے، ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ آپ باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ کچھ اصحاب ایک حلقہ مجلس میں بیٹھے بحث ونزاع میں مشغول ہیں، فرمایا کہ کس مسئلہ میں گفتگو کر رہے ہو؟ عرض کی مسئلہ تقدیر میں، یہ سنتے ہی آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا، راوی کا بیان ہے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی نے چہرہ مبارک پر انار کے دانے نچوڑ دیئے ہیں۔ آپ نے فرمایا ’’کیا تم کو اسی کا حکم دیا گیا ہے کیا تم اسی لیے پیدا کئے گئے ہو، کیا میں یہی پیغام دیکر بھجا گیا ہوں قرآن کی ایک آیت کو دوسری پر ٹپکتے ہو تم سے پہلے جو قومیں تھیں وہ اسی سے ہلاک ہوئیں میں بتاکید کہتا ہوں کہ اس میں جھگڑے نہ کرو‘‘

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام عقائد کی وسعت، اور اُن میں بحث ونزاع کا شائق نہیں، وہ صرف اس

پیغام پر ایمان ویقین کا طالب ہے جو علی الاعلان وہ تمام دنیا کو سناتا ہے جس کے سمجھنے میں نہ عرب کے بدووں اور افریقہ کے حبشیوں کو تامل ہے نہ یونان کے حکیموں اور یورپ کے فلاسفروں کو، بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ ایک صاحب کو ایک غلام مسلمان آزاد کرنا تھا، وہ احمق سی کوئی حبشیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور دریافت کیا کہ یہ مسلمان ہے؟ آپ نے اُس سے پوچھا کہ خدا کہاں ہے؟ اُس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھادی، آپ نے اُن صاحب سے فرمایا، لیجاو یہ مسلمان ہے۔

اللہ اکبر! اسلام کی حقیقت پر کتنے پردے گئے ہیں، آپ اسلام کے لیے صرف آسمان کی طرف اُنگلی اٹھادینا کافی سمجھتے ہے، لیکن ہمارے نزدیک آج کوئی مسلمان مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک؟؟؟ کے تمابندھے ہوئے عقائد پر حرفاً حرفاً آمنت نہ کہتا جائے۔

جنگ هفتا ددولت همه راغذربنه　　　چوں ندید ند حقیقت ره افسانه زوند

پہلی دونشستوں میں ہم یہ اچھی طرح واضح کر چکے ہیں کہ مذہب کی اصلی اور حقیقی تصویر وہی ہے جو داعیِ مذہب کے علم وعمل اور اس کی تعلیم وتلقین کا صحیح اور ہُو بہُو عکس ہو، پیغمبر کی ضرورت ہم نے اسی لیے تسلیم کی ہے کہ عقل انسانی زندگی کی اصلی گرہوں کے کھولنے سے عاجز ہے، اس لیے رحمت الٰہی انسانیت کے ایک بلندترین پیکر کو روح القدس کے توسط سے انسانوں کی رہنمائی کیلیے بھیجتی ہے، وہ لوگوں کی ہر قسم کے تلقینات سے مشرف کرتا ہے، اُن کو ان کی زندگی کے ہر شعبہ کیلیے تعلیمات دیتا ہے، لیکن مافوق الفہم اسرار کے سمجھنے کی حیات انسانی کو حاجت نہیں، اور اس کی عملی زندگی کیلیے اُن کا علم ضروری نہیں، ان کو وہ اسی طرح سربستہ چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے اور ان کے متعلق وہ صرف یہ سکھا جاتا ہے۔

ولایعلم تاویله الاالله والراسخون فی العلم یقولون امنا به کل من عند ربنا

ترجمہ: اس کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو علم میں راسخ اور پختہ ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔

اس بنا پر اگر ہم ان اعتقادات اور تعلیمات پر جو پیغمبر نے انسانوں کے لیے ضروری سمجھے، اپنی عقل اور سمجھ سے کچھ اضافہ کرنا چاہتے، یا کچھ اس میں سے حذف کرنا یا بڑھانا چاہتے ہیں، یا جس گرہ کو جہاں تک اس نے کھول کر چھوڑ دیا ہے ہم اس کو اور کھولنا چاہتے ہیں تو درحقیقت ہم اصل نبوت کے ثبوت کے دعویٰ کو کمزور

کر رہے ہیں، اور عملاً ہم بتانا چاہتے ہیں کہ انسانیت کی تکمیل کے لیے پیغمبر کی حاجت نہیں، بلکہ خود عقل انسانی ہمدردی رہبری کے لیے کافی ہے، حالانکہ اس کا بطلان ہمارے نزدیک بدیہی الثبوت ہو چکا ہے۔

غور کیجیے کہ مذہب کیا چیز ہے؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ انسان کی عملی زندگی کے لیے وہ چراغ راہ ہے، انسان اور اس کی عملی زندگی کا تعلق تمام تر مادیات سے ہے اس لیے ماورائے مادہ کی نسبت صرف وہیں تک اس کو تعلق ہے جہاں تک انسان کی عملی زندگی کے لیے ضروری ہے، ہم اپنے مقصود کو اور زیادہ واضح کرنے کیلیے ذرا تفصیل سے کام لیتے ہیں۔

مذہب میں دو چیزیں ہوئی ہیں، عقائد اور اعمال، دوسرے الفاظ میں ان کی تعبیر ہوسکتی ہے کہ مذہب علم اور عمل سے مرکب ہے۔

علم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو مادیات سے ماخوذ ہے اور انہیں سے وابستہ ہے اور اس کے متعلق ہم میں بذریعہ مشاہد اور تجربہ کے یقین پیدا ہوتا ہے، دوسرا وہ علم ہے جس کا تعلق ماورائے مادہ سے ہے، اور جس کے جاننے کا ذریعہ صرف تخیل، تصور اور ظن ہے، ''آگ جلاتی ہے۔'' یہ علم مادی ذریعۂ احساس سے ہم کو حاصل ہوا ہے، اس لیے ہم کو اس درجہ یقین ہے کہ غلطی سے بھی ہم آگ میں کودنے کی ہمت نہیں کر سکتے لیکن دوسرا علم یہ کہ انسان مرنے کے بعد پھر دوسرا جنم لیتا ہے لیکن اس علم پر اعتماد کر کے کیا کوئی انسان اپنی زندگی کا آپ خاتمہ کر دینے پر تیار ہوگا؟۔

ہماری زندگی اسی عالمِ مادی سے تعلق رکھتی ہے ہمارے اعمال اسی عالم میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، افراد انسانی کی کامیابی اور ناکامی، قوتیں اور قوموں کی ترقی و تنزل، عروج و زوال، انقلاب و تغیر، غرض انسانیت کے جملہ مظاہر اور عالم کا تمام تر نظامِ ترقی انہیں یقینیات اور علوم قطعیہ پر مبنی ہیں، جن کا ماخذ ہمارے حواس ہیں، اس بناء پر ان علوم و مسائل اور معلومات کے پیچھے پڑنا اور انکی گرہ کشائی چاہنا، جو ماورائے حواس ہیں اور جن کے ساتھ ہمارا علم متعلق نہیں ہوسکتا، ہمارے لیے بالکل بے سود اور غیر مفید ہے۔

ہمارا فلسفہ جس کا تعلق ماورائے مادہ سے ہے، ''علم ظنی'' ہے۔ سائنس کا اکثر حصہ ہمارے گذشتہ تجربوں اور مشاہدوں کی بنا پر ایک حد تک درجۂ یقینی رکھتا ہے اب دیکھ لیجیے کہ دنیا ان دونوں میں سے کس کی ممنون ہے۔ فلسفہ کی یا سائنس کی؟

یونان کے سب سے پہلے فلسفی تالیس سے لے کر بیکن کے عہد تک ڈھائی ہزار برس میں فلسفہ دنیا کے لیے کیا

کارآمد ہوا لیکن سائنس نے دو تین سو برس کے اندر اندر عالم میں ایک انقلاب پیدا کردیا، اس بناء پر غیر مادی اور غیر محسوس اشیاء کی نسبت یہ سوال کہ وہ کیا ہیں؟ اور کیونکر ہیں؟ بالکل بے سود ہے اور اس کی دلیل، اس سوال کے حل میں انسانی نسلوں کی گذشتہ صدیوں اور قرنوں کی ناکامی ہے، اس لیے ہماری بحث اور تحقیقات کا موضوع نفاً یا اثباتاً، غیر محسوس اشیاء نہیں ہوسکتیں۔

یہی وہ نکتہ ہے جس کو یورپ نے اب سمجھا ہے اور جس کو اسلام نے اپنے آغاز ظہور ہی میں واشگاف کردیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ اہل السنۃ کے سوا اسلام کے اور فرقوں نے اس کو محفوظ نہیں رکھا، اور یہی آخر ان کی بے راہ روی کا سبب ہوا۔ اور اس کا بڑا نقصان یہ پہنچا کہ ہماری خیالی دنیا وسیع ہوگئی مگر عملی دنیا تنگ ہوگئی۔ منطق وفلسفہ کی خیالی وقیاسی بحثوں کی بھول بھلیوں میں پھنس کر تجربی مادی علوم سے جن کا مدار اشیاء کے خواص وصفات کی معرفت پر ہے، ہم بے خبر ہوگئے اور دشمن ہم سے بازی لے گیا، اور عملی ومادی دنیا کی ہر چیز میں ان کے محتاج ہوگئے، یہ عملی نقصان تو عملی اقتصادی حیثیت سے پہنچا، اور دینی حیثیت سے یہ نقصان پہنچا کہ عقائد کی ان عقلی پیچیدگیوں میں الجھ کر اخلاق وعمل میں ہم سست ونا کارہ رہ گئے۔ اور دین ودنیا ہر حیثیت سے ہماری عملہ قویٰ کمزور اور سست ہوتے چلے گئے، اس تفصیل یہ ظاہر ہوگا کہ اہل سنت کے مذہب کا مدار اور منہیٰ یہ دو اصول ہیں۔

(۱) داعیِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عقائد اور اعمال کے متعلق اپنی اُمت کو جو کچھ تعلیم اور تلقین کی، اس پر استوار رہا جائے، یہی صراط مستقیم ہے۔

(۲) عقائد یا خدا کی ذات اور صفات کے متعلق قرآن نے جو کچھ بیان کیا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بتایا۔ اور جس مسئلہ کی جس حد تک قرآن نے تشریح کی، صرف اسی پر ایمان لانا واجب ہے، صرف اپنی عقل وقیاس واستنباط سے نصوص کی روشنی کے بغیر اس کی تشریح وتفسیر صحیح نہیں، اور نہ اس پر ایمان لانا اسلام کی صحت کے لیے ضروری ہے، بلکہ ممکن ہے کہ وہ گمراہی اور ضلالت کا موجب ہو۔

اسلام کے تمام فرقے اگر ان دو اصولوں پر قائم رہتے تو یقیناً عقائد کے وہ عظیم الشان اختلافات رونما ہوتے، جس کے سیلاب نے ایک مدتِ مدید سے کاشانۂ اسلام کے ارکان متزلزل کر رکھے ہیں، خوب غور کیجیے، گذشتہ مباحث میں ہم نے مختلف فرقوں کے جو مسائل اور معتقدات گنائے ہیں اُن کی گمراہی کا سبب صرف یہی ہے کہ انہوں نے ان امور کی تفصیل چاہی جن سے قرآن خاموش تھا، اور جن کی تشریح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضروری نہیں سمجھی، کہ اول تو وہ اُن سربستہ اسرار اور مشکل عقدوں میں سے ہیں جن کا حل عقل انسانی

کے فہم وادراک سے باہر ہے، اور ثانیاً یہ کہ انسان کی عملی زندگی کیلیے ان کا علم بے سود ہے۔

شریعت نے خدا کے متعلق یہ بتایا کہ وہ ایک ہے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا وہ تمام اعلیٰ صفتوں سے متصف ہے، اور ہر عیب سے پاک ہے، اس کے بعد یہ بحث کہ وہ ایک کس حیثیت سے ہے، صفات کی مختلف قسمیں ہیں، کون سی صفتیں اُس میں پائی جاتی ہیں، یہ صفات اُس کی ذات میں داخل ہیں یا اُس کی ذات سے الگ ہیں، اگر الگ ہیں تو قدیم ہیں یا حادث، اگر قدیم ہیں تو تعدد قدما لازم آتا ہے، حالانکہ، حالانکہ قدیم صرف ایک ہی ہے، اگر حادث ہو تو خدا محل حادث ہوگا، اور محل حادث خود حادث ہوتا ہے اگر الگ نہیں بلکہ ذات میں داخل ہیں تو ذات کا جز ہوکر یا کل ہوکر، اگر ذات کا جز ہے تو خدا کی ترکیب لازم آتی ہے، اور اگر کل ہے تو عین ذات ہوگی، اس لحاظ سے اس کی ذات اور صفات میں سے ایک کی نفی لازم آئے گی، اور علم، قدرت، سمع، بصرہ، ارادہ وغیرہ مختلف صفات مختلف نہیں ، بلکہ متحد ہوجائیں گی۔

خدا کی نسبت ہاتھ، پاؤں، منہ اور قدم کے الفاظ کتاب وسنت میں آئے ہیں۔ ان سے حقیقی معنی مراد ہیں یا مجازی، خدا کی نسبت قرآن میں ہے، کہ ''وہ عرش پر مستوی ہوا۔ اور یہ بھی ہے کہ جدھر رُخ کرو اُدھر ہی خدا کا منہ، یہ بھی ہے کہ ''وہ تمھاری رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔'' تو آیا وہ کسی خاص جگہ میں ہے، یا جگہ سے مبّرا ہے، پہلی صورت میں اس کا جسم ہونا لازم آتا ہے، اور دوسری صورت میں کسی خارجی موجود کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ہر جگہ موجود ہے، سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔

احادیث صحیحہ میں ہے کہ قیامت میں خدا بہشت میں بہشتیوں کو نظر آئے گا، اب اس پر بحث کہ اگر یہ تسلیم کر لیں گے تو لازم آئے گا کہ وہ جسم ہو، کسی خاص جگہ میں ہو اور اگر نظر آنا تسلیم کریں تو انہیں آنکھوں سے وہ رویت ہوگی، یا کسی اور جدید حاسّہ، ان آنکھوں سے نظر آنا، خدا کیلیے جسم، رنگ، تحدید، تعیین وغیرہ کو مستلزم اور آخری صورت میں موجودہ ذرائع احساس کے علاوہ کسی اور ذریعہ احساس کا اعتقاد فہم سے بالاتر ہے۔

شریعت میں اس قدر ہے کہ خدا نے عالم کو پیدا کیا اور وہ اس کا مخلوق ہے، اس کے بعد یہ مباحث کہ خداوند تعالیٰ اس کی علت کامل ہے یا ناقص، اگر علت ناقص یعنی غیر تامہ ہے تو عالم کی خالقیت کے لیے کسی اور شے کی شرکت بھی لازم آتی ہے۔ اور اگر علت کامل یعنی تامہ ہے تو علت تامہ اور معلول کا وجود ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ اس بناء پر عالم کو بھی قدیم ہونا چاہیے۔

قرآن نے بتایا ہے کہ بندوں کے تمام افعال خدا کے حکم سے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد یہ سوالات کہ اسکا حکم ہی

فعل کے وجود کا سبب ہوتا ہے، یا بندہ کے عمل کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اگر دخل نہیں تو بندہ کو مجبور محض کہنا ہوگا۔ اگر دخل ہے تو یہ دخل موثر ہے یا غیر موثر، اگر موثر ہے تو درحقیقت وہ اپنے فعل کا آپ خالق ہوا، اور اگر غیر موثر ہے تو دوسرے معنی میں جبر ہے۔

یہ تمام مذکورہ بالا مسائل اور ان کی جو تشقیقیں کی گئی ہیں وہ نفیاً یا اثباتاً کسی نہ کسی فرقہ کا معتقد علیہ اور مسلک ہیں، لیکن آپ نے دیکھا کہ عقلی توہم پرستی کے اعتراضات سے ان میں سے کوئی شق بھی بُری نہیں، یہ اعتراضات یا لوازم متخیلہ یا عقلی سرگردانیاں کیوں پیدا ہوئیں، اس لیے کہ ہم قرآن کی تلقینات پر قناعت نہیں کرتے، اور ان امور کی تشریح چاہتے ہیں جن کی تشریح سے عقلِ انسانی عاجز ہے، اور ہماری عملی زنگی کے لیے وہ غیر ضروری ہیں

۔

اگر ہم اپنے معتقدات کے احاط کو اس دائرہ کے اندر کرلیں جس کو وحی الٰہی کے پرکار نے سطح اسلام پر کھینچا ہے، تو یہ حصار ہمارے لیے یقیناً قلعہ روئیں کا کام دے گا، اور ہم ان بہت سے خدشوں اور حملوں سے محفوظ ہوجائیں گے۔ جو قرآن کی تصریحات کے سبب نہیں بلکہ خود ہمارے عقلی تفصیلات کے باعث ہم پر عائد ہوتے ہیں اور غلطی سے ہم ان کا مستوجب اپنے مذہب کو قرار دیتے ہیں، بہت سے فرقِ اسلامیہ سے بڑی مسامحت یہ ہوئی کہ عقل اور فلسفہ نے جس امر کے متعلق بھی کوئی جواب چاہا انہوں نے اپنے ناخنِ تدبیر سے اس کو حل کیا، اور نفیاً یا اثباتاً اس کو داخل مذہب کرلیا، یہاں تک کہ خالص فلسفیانہ مسائل جن کو مذہب سے ایک ذرہ تعلق نہیں مثلاً جزء الذی لایتجزیٰ کی بحث، طغرہ کا مسئلہ، رویت کے اسباب، استطاعت مع الفعل کی بحث وغیرہ اس کو بھی انہوں نے عقائد کی کتابوں میں داخل کرلیا ہے اگر آج ہمارے عقائد کی کتابوں کی چھان بین کی جائے تو نصف سے زیادہ اوراق انہیں مباحث سے بھرے ملیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ متکلمین نے عقائدِ صحیحہ پر جو شکوک وشبہات مدعیانِ عقل کی طرف سے عائد ہوئے ان کے جواب کی خاطر ان مسائل میں بحث کی، اور بعض پہلوؤں کی تصریح پر وہ مجبور ہوئے اور اس طرح علم کلام کا یہ سارا دفتر وجود میں آیا، اور اس لیے بھی یہ بحثیں کیں کہ فِرقِ ضالہ کے آرائے باطلہ سے مسلمانوں کو بچائیں، اور یہ کوششیں ان کی مشکور ہوئیں، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے سیدھے سادے عقائد میں الجھنیں بھی پیدا ہوگئیں۔

الغرض اہل السنۃ نے جو صراط مستقیم اختیار کیا وہی درحقیقت اس طوفان افکار اور طغیان خیالات کی حالت میں

صفینۂ نوح ہوسکتا تھا،لیکن دوتین سو برس کے بعد تیسری چوتھی صدی میں جب مسلمانوں میں فلسفہ نے عروج حاصل کرلیا ارمما لک اسلامیہ کے درودیوار سے اس آواز کی بازگشت آنے لگی،تو خود اہل السنۃ میں سے چند افراد اٹھے اور قدیم شاہراہ کو چھوڑ کر انہوں نے اہل السنۃ اور دیگر فرقوں کے درمیان ایک نیا راستہ پیدا کیا،اور عقل ونقل اور فلسفہ وسنت کے درمیان ایک متذبذب صورت کو اپنا مسلک قرار دیا،انہوں نے یہ سمجھا کہ اس طریقہ سے وہ عقل ونقل اور فلسفہ وشریعت کی تطبیق میں نہ تو معتزلہ کی طرح قرآن وسنت سے دور پڑ جائیں گے۔اور نہ ارباب ظواہر کی طرح اہل فلسفہ کے نشانۂ اعتراضات بنیں گے،لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے یہ مسائل نہ تو اصل قرآن وسنت کے مطابق رہے۔اور نہ عقل وفلسفہ کے دربار ہی میں وہ رسوخ پا سکے۔

مثلاً ایک طرف تع انہوں نے معتزلہ کے ساتھ ہوکر خدا کے لیے اعضاء کے اطلاق سے انکار کیا اور اُن آیتوں میں جن میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اور منہ کا ذکر ہے تاویل کی،اور دوسری طرف ظاہریہ کے ساتھ خدا کی رویت کا اقرار کیا،نتیجہ یہ ہوا کہ نہ وہ اہل السنۃ کا ساتھ دے سکے،اور نہ اہل فلسفہ کی معیت برقرار رہ سکی۔ان کو بدیہیات کا انکار کرنا پڑا کہ رویت کے لیے مرئی کا جسم ہونا،متحیز ہونا،ذی لونا ہونا،آنکھ کے سامنے ہونا،اس سے ایک مسافت پر ہونا،ضروری نہیں،ایک اور مسئلہ میں یعنی مسئلہ جبر وقدر میں انہوں نے اسی قسم کا توسط اختیار کیا، ایک طرف تو یہ کہا کہ تمام افعال کا خالق خدا ہے،یہ کہہ کر گویا اپنے کو معتزلہ اور قدریہ سے الگ کیا،دوسری طرف انسان کے لیے کسب ثابت کیا کہ جبر نہ لازم آئے،لیکن جب یہ سوال کیا گیا کہ کیا یہ کسب فعل کے وجود میں مؤثر بھی ہے۔تو جواب نفی میں دیا،نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جبر سے قریب ہوگئے،جیسا کہ ہر صاحب نظر کو تفسیر کبیر میں امام رازی کا نداز نظر آتا ہے۔

جس طرح اسلام میں بہت سے ایسے فرقے ہیں جو درحقیقت دائرہ اسلام میں داخل نہیں،اسی طرح بہت سے ایسے فرقے بھی ہیں جو خود کو اہل السنۃ کہتے ہیں لیکن حقیقۃً وہ ان میں سے نہیں ہیں،سبب یہ ہے کہ قرمائے اہل السنۃ لے جو اصول قرار دیئے تھے۔دیگر عقل پرستوں کے اعتراضات سے مرعوب ہوکر متاخرین نے ان میں تبدیلی کردی اور بایں ہمہ وہ اپنے کو اہل السنۃ سمجھتے ہیں،بلکہ لفظ اہل السنۃ کا صحیح طلب صرف اپنے ہی کو جانتے ہیں۔

تیسری چوتھی صدی سے اہل النۃ تین عظیم الشان شاخوں میں منقسم ہیں۔

اشاعرہ،حنابلہ،اور ماتریدیہ،اشاعرہ امام ابوالحسن اشعریؒ کی طرف منسوب ہیں،اور امام شافعیؒ کے عقائد کے

شارح سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے تمام شوافع اشعری ہیں، حنابلہ اپنے آپ کو احمد بن حنبلؒ کا پیرو کہتے ہیں۔
ماتریدیہ امام منصور ماتریدی کے پیرو ہیں، جو بچند واسطہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد تھے اسلیے احناف نے عقائد میں ان کو اپنا امام مانا، بہرحال ان بزرگوں کے باب میں جو اقوال ملتے ہیں وہ فائدے اہل السنتہ اور سلف صالح کے مطابق ہیں، لیکن متاخرین اہل السنتہ سے بڑی مسامحت یہ ہوئی کہ ان مسائل کے متعلق جن سے شریعت خاموش تھی، اُن کو خوالہ علم؟؟؟؟ (اس لفظ کو درست کرنا ہے) الٰہی کرنے کے بجائے اُن کی نسبت دیگر فرقوں کی طرح ادعای، پہلو اختیار کیا اور بہت سے فلسفیانہ مسائل کو جن کو شریعت سے اصلا تعلق نہ تھا اُن کو داخل عقائد کر دیا۔
ان تصریحات سے واضح ہوگا کہ تارکین سنت اور متاخرین اہل سنت جنہوں نے معتزلہ اور دیگر عقل پرست فرقوں سے مرعوب ہو کر قدمائے اہل سنت کے اصول میں ترمیم کی اور اپنے مذہب کو قواعد عقلی کے مطابق بنانے کی کوشش کی، نتیجہ کی رُو سے ان دونوں میں بہت ہی فرق ہے کم، اور درحقیقت ان متاخرین کے اقوال کو سلف صالح اور اہل سنت کے عقائد اور خیالات سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور اگر ہے تو صرف اس قدر جس قدر وہ کتاب وسنت سے قریب ہیں۔
جب ایک مسئلہ کے متعلق شریعت نے کچھ نہیں بتایا اور نہ اُس کا جاننا اور اس کی اپنی عقل سے تفصیل کرنا مدار ایمان ٹھہرایا اور نہ کسی حیثیت سے داعی اسلام نے اپنے مومنین سے اس پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا، اس کے متعلق آپ کا نفیاً یا اثباتاً کوئی بھی پہلو اختیار کرنا اور اس کو اسلام کا مبنیٰ قرار دینا کیا حقیقت رسی ہے؟ کیا اس بارہ میں آپ کا فعل دوسرے فرقوں کے فعل کے مقابلہ میں کچھ زیادہ مستحسن ہوگا؟ اگر ان گرہوں کے کھولنے کیلیے آپ کی عقل رہبر بن سکتی ہے تو آپ آگے بھی بڑھ سکتے ہیں۔ اور نعوذ باللہ پیغمبروں کی آمد و بعثت سے بھی اپنے کو مستغنی بتا سکتے ہیں۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر تقریباً ایک لاکھ نفوس قدسیہ نے ایمان واسلام کی بیعت کی، لیکن کیا آپ کو وہ دفعات نا معلوم ہیں جن پر اُن کے ایمان اور اسلام کی بنا تھی، کیا آپ کے پیدا کردہ عقائد کلامی میں سے ایک بھی اُن کے سامنے پیش کیا گیا اگر نہیں تو اپنے خود ساختہ اصول کی حیثیت سے نعوذ باللہ آپ ان کو کیا کہیں گے۔ اُن کا ایمان صرف یہ تھا جس کو سورۂ بقرہ کے اول و آخر مین بیان کیا گیا ہے۔

امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون کل امن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ لا نفرق

بین احد من رسله (بقرہ آخر)

ترجمہ: پیغمبر جو کچھ اُس پر اُس کے خدا کی طرف سے اُترا اس پر ایمان لایا، اور تمام مومنین، ہر ایک، خدا پر ایمان لایا، اس کے تمام فرشتوں پر، اُس کی تمام کتابوں پر اس کے تمام پیغمبروں پر ہم اُس کے پیغمبروں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔

یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالاخرہ ھم یوقنون (بقرہ اول)

ترجمہ: (متقی لوگ) جو کچھ تجھ پر اُترا اور تیرے پہلوں پر اُترا ایمان لاتے ہیں۔ اور آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن میں خدا نے بتایا ہے کہ کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے جب کوئی شخص قرآن پر ایمان لایا تو اس کے اندر جو کچھ ہے اجمالاً یا تفصیلاً ان سب پر ان ایمان لایا، خدا کے جو صفات اس میں مذکور ہیں، کتب الٰہی، ملائکہ اور پیغمبروں کے متعلق اُس میں جو کچھ ہے، قیامت، حشر ونشر، دوزخ وبہشت کی نسبت جو حالات اس میں مذکور ہیں یہ تمام چیزیں اسکے اندر داخل ہوگئیں، چنانچہ قدمائے اہل سنت اور سلف صالح کا اعتقاد یہ تھا کہ اُن میں سے ہر چیز پر ایمان اسی حیثت سے اور اسی حد تک لانا ضروری ہے جہاں تک قرآن مجید نے اس کا مطالبہ کیا ہے، یا جہاں تک سنتِ صحیح اور متواتر نے ثابت کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ متفق طور سے ثابت ہے کہ عقائد کا ثبوت صرف قرآن مجید سے ہوسکتا ہے اور احادیث میں سے صرف اُن حدیثوں سے جو بذریعہ تواتر مروی ہیں۔

شب آخر گشتہ وافسانہ از افسانہ می خیزد

کل کی نشست میں ہم نے بتایا تھا کہ قدمائے اہل السنۃ کے یہ دو اصول تھے۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عقائد واعمال کے متعلق اپنی امت کو جو کچھ تعلیم وتلقین فرما گئے اس پر ایک ذرہ کا اضافہ یا اس سے ایک ذرہ کی کمی نہیں ہوسکتی۔

(۲) خدا کی ذات وصفات ودیگر عقائد کے متعلق قرآن نے جو بیان کیا ہے یا پیغمبر سے متواتر جو کچھ ثابت ہے ،اور ان کی نسبت اجمالاً یا تفصیلاً جو کچھ اور جس حد تک انہوں نے تفسیر وتشریح کی ہے اسی پر ایمان لانا واجب ہے ،اپنی عقل وقیاس اور استنباط سے ان کی تفسیر وتشریح کرنے صحیح نہیں، اور نہ اُس پر ایمان لانا ہمارے ایمان کا جزو ہوسکتا ہے۔

یہ دو اصول ایسے ہیں جن کے اثبات کے لیے کسی مزید دلیل کی نسبت کی حاجت نہیں کیونکہ جیسا ہم اس پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ اکثر ایسے مسائل ہیں جن کی نسبت عقل کا نفیاً یا اثباتاً ہر قسم کا فیصلہ نا قابلِ لحاظ ہے کہ یہ حدود اس کے دسترس سے باہر ہیں، اور اسی لیے ہم کو ایک پیغمبر کی ضرورت ہے، جو ہمارے علم کے دسترس سے باہر کی چیزوں کو ہمارے حق میں جہاں تک مفید و نافع ہو تعلیم دے، اور جب یہ مقدمہ صحیح ہے تو ان